طوفانی رات

مرزا ادیب

(گزشتہ سے پیوستہ)

کیوں راشد بیٹا! کیا بات ہے، سوئے نہیں ابھی تک؟

نہیں امی! نیند نہیں آرہی۔

امی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

نیند کیوں نہیں آرہی؟ انھوں نے فکرمندانہ انداز میں پوچھا۔

راشد نے بتایا: امی! مجھے اس رات کا واقعہ یاد آگیا، وہ واقعہ امی! جس میں ایک اجنبی شخص نے آپ کی مدد کی تھی۔ آپ کو کھانا لاکر دیا تھا اور یہ لالٹین بھی آپ کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

ہاں بیٹا! دنیا میں ایسے نیک لوگ بھی ہوتے ہیں۔ کوئی فرشتہ تھا اللہ کا۔ میں جان ہی نہ سکی کہ کون ہے اور کون نہیں۔

راشد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا: امی! یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے آس پاس بھی کوئی ایسا ہی گھر ہو، جسے اس وقت کسی مدد کی ضرورت ہو؟

امی نے راشد کو بازو پھیلا کر گود میں لے لیا: ہوسکتا ہے بیٹا!

مجھے اجازت دیں امی! میں لالٹین لے کر باہر جاؤں اور کسی کو میری ضرورت ہو تو اس کی مدد کروں۔

امی سوچ میں پڑ گئیں۔

امی سوچئے نہیں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ دنیا میں نیک لوگ بھی ہوتے ہیں...تو کیا آپ کا بیٹا ان نیک لوگوں میں شامل نہیں ہوسکتا۔

امی نے اس کے جواب میں بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: جاؤ بیٹا! لالٹین لے جاؤ۔ اللہ پاک تمہاری حفاظت کرے۔

راشد لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک کچے راستے پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

اس وقت تک وہ جہاں جہاں سے گزرا تھا، اس نے تقریباً سبھی گھروں میں روشنی دیکھی تھی۔ گھروں کے اندر سے آنے والی آوازیں بھی سنی تھیں۔ اپنے محلے سے نکل کر وہ دوسرے محلے میں چلا گیا۔ ایک گلی سے گزرتے ہوئے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں روشنی بالکل نہ تھی۔

ان مکانوں کے اندر کیا لوگ نہیں رہتے!

یہ سوال اس کے ذہن میں آیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی لالٹین کی روشنی میں ایک دروازے پر دستک دی۔

کون ہے؟ یہ آواز کسی بوڑھے آدمی کی معلوم ہوتی ہے! راشد نے سوچا۔

جی میں ہوں۔

میں کون؟

جی راشد۔

پھر کئی منٹ یوں ہی گزر گئے۔ آخرکار دروازہ کھلا۔ راشد نے اپنے سامنے ایک کمزور اور نحیف بوڑھے کو دیکھا۔

کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟ بوڑھے نے پوچھا۔

جناب، رات طوفانی ہے، ایسی رات میں گھر سے باہر نکلنا ذرا مشکل ہے۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیے۔

اس لمحے بوڑھے نے جھک کر راشد کو دیکھا کچھ توقف کیا اور کہا: اگر ایسا ہے تو مجھے بازار سے کچھ کھانے کے لیے لادو۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔

ضرور لادوں گا جناب! مجھے ایک دکان کا علم ہے جو رات بھر کھلی رہتی ہے۔

بڑی مہربانی۔ یہ لو پیسے۔ میرے لیے ایک بن کافی ہوگا۔ بوڑھے نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

نہیں، بابا جی! میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ آپ کے لیے بن خرید سکوں۔ یہ کہہ کر راشد چل پڑا۔ راشد نے سن رکھا تھا کہ اسپتال کے پاس چند ایسی دکانیں ہیں جو رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ ایک دکان پر بسکٹ وغیرہ بھی فروخت ہوتے ہیں۔ یہ دکانیں وہاں سے کافی دور تھیں۔ کیچڑ میں چلنا ویسے بھی مشکل تھا اور اندھیری رات میں تو یہ کام اور بھی مشکل تھا۔

راشد ایک بار گر بھی پڑا، مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک دکان سے اس نے ایک بن، مکھن اور کچھ بسکٹ خریدے اور واپس چلنے لگا۔ آدھے پونے گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ بوڑھے کے دروازے پر آ گیا۔

لیجیے بابا جی!

شکریہ میرے بیٹے! اللہ تیرا بھلا کرے۔

بوڑھا، راشد کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

راشد کو چارپائی پر بٹھایا اور خود کھانا شروع کیا۔

جب پیٹ بھر گیا تو وہ بولے: بیٹا! یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔

کون سی بات بابا جی!

بیٹا! آج سے کئی برس پہلے میں نے بھی ایسی ہی ایک طوفانی رات میں ایک عورت کے لیے کھانے کا انتظام کیا تھا۔

تو آپ...؟ راشد فقرہ بھی مکمل نہ کرسکا۔ یہ سن کر اسے سخت حیرت ہوئی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

بابا جی! کوئی اور خدمت؟

نہیں بیٹا! بہت بہت شکریہ۔

راشد دروازے سے نکلنے لگا۔

ارے بیٹا! لالٹین تو لیتے جاؤ۔ بوڑھے نے راشد کو لالٹین کے بغیر جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

بابا جی! یہ لالٹین آپ ہی کی ہے۔ اور راشد نے ساری بات سنادی۔

بوڑھے نے لالٹین اُٹھالی۔

بیٹا! میں بوڑھا ہوچکا ہوں۔ بیمار بھی رہتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ لالٹین تم جیسے نوجوانوں کے لیے ہے۔ ہاں اگر ممکن ہو تو روشنی کی اس علامت کو ایک کے بعد دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے رہنا۔

□❖□

قدیم بارہ شہزادیاں

اُمامہ یوسف

قدیم زمانے میں ایک بادشاہ تھا، جس کی بارہ بیٹیاں تھیں یعنی بارہ شہزادیاں۔ اُن کی خوبصورتی کا کیا کہنا تھا۔ سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بادشاہ نے اُن کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو اُس کو ایک حیران کن راز کا پتہ چلا کہ شہزادیاں رات بھر رقص کرنے کیلئے جاتی ہیں مگر کسی کو بھی نہیں پتہ چلتا کہ وہ کہاں اور کیسے جاتی ہیں۔

بادشاہ بہت پریشان تھا۔ اُس نے قلعے کے سب دروازے بند کروا دیے تاکہ شہزادیاں باہر نہ جاسکیں لیکن اُس کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ وہ پریشان تھا کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔ بادشاہ نے اعلان کروایا کہ جو کوئی شہزادیوں کے رقص کا پتہ لگائے گا، اُسے اپنی پسندیدہ شہزادی سے شادی کرنے کا موقع ملے گا اور وہ میرے مرنے کے بعد بادشاہ بھی بنادیا جائے گا اور اگر وہ تین دن میں اس راز کا پردہ فاش نہ کر پایا تو اُسے موت کی سزا دے دی جائے گی۔

یہ خبر ریاست میں ہر طرف پھیل گئی۔ ایک شہزادہ آیا جو رقص کے راز کا پتہ لگانا چاہتا تھا، اُس نے کہا: میں آپ کی پڑوسی ریاست کا شہزادہ ہوں اور شہزادیوں کے رقص کا پتہ لگانے آیا ہوں، بادشاہ نے اُس کا استقبال کیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اُسے شہزادیوں کے کمرے کے ساتھ والا کمرہ سونے کیلئے دے دیا گیا۔

شہزادیوں کے کمرے کا دروازہ کھلا رکھا گیا اور شہزادے کا پلنگ ایسے رکھا گیا کہ وہ ساری رات اُن پر نظر رکھ سکے۔

رات کو شہزادیاں اُس کے لیے شربت لے کر آئیں جس کو پیتے ہی اُسے نیند آ گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو شہزادیاں رقص کر کے واپس آ چکی تھیں۔ تینوں دن ایسے ہی چلتا رہا، چوتھے دن جب شہزادہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا تو اُس کے پاس بادشاہ کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ بادشاہ نے اُسے موت کی سزا دے دی۔ یونہی بہت سے لوگ آئے لیکن سب ناکام رہے۔ پھر ایک دن ایک زخمی سپاہی اپنی قسمت آزمانے بادشاہ کی ریاست کی طرف چل پڑا۔

راستے میں اُسے ایک بڑھیا ملی، سپاہی نے بڑھیا کی مدد کی، بڑھیا نے بدلے میں اُسے ایک پوشاک دی اور کہا کہ یہ پہن کر تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے اور یہ بھی بتایا کہ جو جوس شہزادیاں تمہیں دیں، وہ مت پینا۔ سپاہی بادشاہ کی ریاست میں پہنچ گیا۔ بادشاہ نے اُس کا استقبال کیا اور اُسے بھی شہزادیوں کے رقص کا راز معلوم کرنے کیلئے تین دن دیے گئے۔

رات کو بڑی شہزادی اُس کیلئے جوس لے کر آئی۔

سپاہی چونکہ بہت ذہین تھا، اُس نے جوس پی تو لیا مگر نگلا نہیں کیونکہ اُس نے منہ میں سپنج رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی شہزادی کمرے سے باہر نکلی اُس نے سپنج منہ سے نکالا اور سونے کی اداکاری کرنے لگا۔ شہزادیاں اُس کو سوتا دیکھ کر خوش ہوئیں اور رقص کرنے کیلئے تیار ہوگئیں۔ سب سے بڑی شہزادی نے اپنا پاؤں زور سے اپنے پلنگ پر مارا تو وہ زمین دوز ہوگیا اور پھر ساری شہزادیاں اُس خفیہ راستے سے نیچے اُترنے لگیں۔

سپاہی یہ سب دیکھ رہا تھا اُس نے بڑھیا کی دی ہوئی پوشاک پہن لی اور اُن کا پیچھا کرنے لگا۔ آدھا راستہ اُترنے کے بعد چھوٹی شہزادی کو شک ہوا کہ شاید کوئی اُس کے پیچھے ہے مگر پوشاک کی وجہ سے سپاہی کسی کو بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ سب سے خوبصورت حصے میں پہنچ گئی جہاں درختوں پر لگے پتے چاندی کے تھے۔ سپاہی نے ثبوت کیلئے ایک پتہ توڑ لیا اس کے توڑتے ہی ایک زوردار آواز آئی جس سے سب ڈر گئیں۔

آگے سب پتے سونے کے تھے، سپاہی نے ایک سونے کا پتہ بھی توڑ لیا اور آگے جا کے ایک ہیرا بھی ثبوت کیلئے لے لیا۔

پھر شہزادیاں ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئیں، جہاں 12 شہزادے ناؤ کے ساتھ اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر ایک شہزادی ایک ایک شہزادے کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سپاہی چھوٹی شہزادی کے ساتھ بیٹھا رہا اور سب جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ گئے جہاں ایک عالیشان قلعہ تھا اور وہاں ساز بج رہے تھے اور اُس کی دُھن پر سب شہزادیاں رقص کرنے لگیں۔

صبح تین بجے تک یہ سب چلتا رہا جب تک اُن کے جوتوں میں چھید ہوگئے اور پھر سب واپس آ گئیں اور سپاہی بھی جلدی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں جا کر سو گیا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا، سپاہی اُن کا تعاقب کرتا رہا اور ثبوت بھی لاتا رہا اور اُن سے پہلے ہی آ کر سو بھی جاتا یوں کسی کو شک بھی نہیں ہوا۔

جب فیصلے کی گھڑی آئی تو بادشاہ نے سپاہی کو بلایا۔

سپاہی نے کہا عالی جاہ! سبھی بارہ شہزادیاں اپنے کمرے سے زمین دوز سرنگ سے جاتی ہیں جہاں ایک قلعہ ہے، اُس نے ثبوت بھی دکھائے۔ شہزادیوں نے یہ سب مان لیا۔ بادشاہ نے اس سپاہی کو خوب انعام سے نوازا اور پوچھا میری کس بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ اُس نے سب سے بڑی شہزادی کو پسند کیا اور پھر دونوں کی شادی دھوم دھام سے کردی گئی۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ میری وفات کے بعد میرا داماد اس سلطنت کا بادشاہ ہوگا اور پھر سبھی ہنسی خوشی رہنے لگے۔□❖□

وفادار ہاتھی

صدف سراج

یہ کہانی پرانی ہونے کے ساتھ ساتھ سچی بھی ہے۔ یہ بات مغلوں کے دور کی ہے، آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا ایک ہاتھی تھا، نام تھا اُس کا مولا بخش۔ یہ ہاتھی اپنے مالک کا بے حد وفادار تھا۔ ہاتھی خاصہ بوڑھا تھا مگر تھا بہت صحت مند۔ بہادر شاہ ظفر سے پہلے بھی کئی بادشاہوں کو سواری کروا چکا تھا۔ فطرتاً شریر اور شوخ تھا، ہر وقت مست رہتا تھا۔ اپنے مہاوت کے سوا کسی کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔

یہ ہاتھی کھیلنے کا بڑا شیدائی تھا۔ قلعے کے قریب بچے اُس کے گرد اکٹھے ہوجاتے تھے اور مولا بخش اُن کے ساتھ ساتھ کھیلتا رہتا۔ پہلے بچے اُسے کہتے کہ ایک ٹانگ اُٹھاؤ تو وہ اُٹھالیتا۔ بچے کہتے ایک گھڑی (یعنی ایک منٹ) پوری ہونے سے پہلے نہ رکھنا۔ وہ ایک گھڑی یعنی ایک منٹ تک ایسے ہی رہتا۔ پھر بچے کہتے گھڑی پوری ہوئی تو وہ ٹانگ نیچے رکھ دیتا۔ پھر وہ مخصوص آواز نکالتا جس کا مطلب ہوتا کہ ’’بچو! اب تمہاری باری آئی۔‘‘ چنانچہ بچے اپنی ٹانگ اُٹھا لیتے۔ گھڑی پوری ہونے سے پہلے کوئی بچہ ٹانگ نیچے کرنے لگتا تو ہاتھی زور زور سے سر ہلاتا، یعنی ابھی گھڑی پوری نہیں ہوئی۔ غرض وہ بچوں کے ساتھ بہت خوش رہتا تھا۔ اُنہیں اپنی سونڈ سے گنے اُٹھا اُٹھا کر دیتا۔ جس دن بچے نہ آتے، اُس دن شور مچاتا۔ مجبوراً مہاوت بچوں کو بلا کر لاتا۔ ویسے تو یہ بہت شوخ ہاتھی تھا لیکن جب بادشاہ کی سواری کا موقع آتا تو بہت مؤدب اور سنجیدہ ہوجاتا۔ جب تک بادشاہ صحیح طرح سے بیٹھ نہ جائے کھڑا نہ ہوتا تھا۔ 1857ء میں جب انگریز قلعہ پر قابض ہوئے اور بہادر شاہ ظفر نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تو مولا بخش بہت اُداس ہوگیا۔ بادشاہ سے بچھڑنے کا اُسے اِتنا غم ہوا تھا کہ اُس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔

قلعے کے نئے انگریز انچارج سانڈرس کو یہ خبر ملی تو اُس نے لڈو اور کچوریوں سے بھرے ٹوکرے منگوائے اور ہاتھی کے سامنے رکھے۔ ہاتھ نے اپنی سونڈ سے وہ تمام ٹوکرے اُٹھا کر پھینک دیے۔ سانڈرس کو غصہ آ گیا کہ یہاں تو ہاتھی بھی باغی ہے۔ اُس نے ہاتھی کی نیلامی کا حکم دے دیا۔ ہاتھی کو بازار میں کھڑا کر دیا گیا مگر کوئی بھی بولی نہیں لگا رہا تھا۔ پھر ایک پنساری نے ڈھائی سو روپے کی بولی لگائی اور ہاتھی اُس کے ہاتھ نیلام کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مہاوت نے یہ دیکھ کر کہا: مولا بخش! ہم دونوں نے بادشاہ کی بہت غلامی کر لی، اب تو تجھے ہلدی بیچنے والے کے دروازے پر جانا پڑے گا۔ یہ سننا تھا کہ ہاتھی دھم سے زمین پر گرا اور مر گیا۔ ہاتھی کی وفاداری کا یہ قصہ بہت انوکھا ہے۔ مولا بخش نے مالک کے سوا کسی کے پاس رہنا پسند نہ کیا اور اس غم نے اُس کی جان لے لی۔□❖□

کنجوسی کی سزا

خدیجہ مغل

بہت دنوں کی بات ہے۔ بغداد میں ایک سوداگر رہتا تھا جس کا نام ابو قاسم تھا۔ وہ بہت کنجوس تھا۔ ایک ایک پیسے پر جان دیتا تھا۔ ابو قاسم کے پاس روپوں کے ڈھیر لگے تھے، وہ انہیں روز گنتا اور بہت خوش ہوتا۔ دن رات اسی فکر میں رہتا کہ کسی طرح اس کی دولت بڑھتی رہے مگر گھٹے نہیں۔ سارے بغداد کو معلوم تھا کہ ابو قاسم بہت امیر آدمی ہے۔ مگر ابو قاسم سب کو یہی کہتا کہ وہ بہت غریب آدمی ہے۔ وہ روکھی سوکھی کھاتا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے اور اتنے گندے ہوتے کہ دیکھنے سے ہی گھن آتی تھی اور اس کے جوتے؟ توبہ توبہ جوتے تو ایسے تھے کہ بھکاریوں کے پاس بھی اس سے اچھے جوتے تھے، ان جوتوں کی اتنی دفعہ مرمت ہوئی کہ اصل چمڑا غائب ہوگیا تھا اور پیوند ہی پیوند دکھائی دیتے تھے۔

ابو قاسم کے دوست اسے کہتے تھے۔ میاں تم نے تو بھکاریوں کو بھی مات دے ڈالی۔ ارے بھئی اب تو نئے جوتے خرید لو۔ ان کی جان چھوڑ دو۔

ابو قاسم کہتا تھا: ابھی تو یہ بہت چلیں گے۔ پھینک کیسے دوں؟

تو ابوقاسم یہی جوتے پہن کر روزانہ بازار جاتا تھا پرانا مال بیچتا اور نیا خریدتا اور خوب نفع کماتا تھا۔ اس کی دولت بڑھتی جارہی تھی۔ ایک دن ابو قاسم نے بہت سی خوبصورت سی نازک سی شیشیاں خریدیں۔ پھر اس نے بڑھیا عطر خریدا۔ ابو قاسم شیشیاں گھر لے آیا اور عطر بھی۔ اس نے شیشوں میں عطر بھرا اور خوش ہوکر بولا: آہا! یہ عطر بیچ کر خوب منافع کماؤں گا۔

اسی خوشی میں اس نے سوچا کہ آج کسی شاندار حمام میں غسل کرنا چاہیے۔ قاسم حمام میں گیا تو وہاں کچھ دوست مل گئے۔ انہوں نے اس کے پھٹے پرانے جوتے دیکھے تو بولے بھئی اگر پیسے نہیں خرچ کرنا چاہتے تو ہم سے لے لو مگر خدارا یہ جوتے تبدیل کرلو۔

قاسم نے ہنس کر بات ٹال دی۔ پھر اس نے جوتے اور کپڑے اتار کر ایک طرف رکھ دیے اور غسل خانے میں گھس گیا۔ اتنے میں شہر کا کوتوال حمام میں نہانے کے لیے آ گیا۔ اس نے بھی کپڑے اور جوتے اتارے اور دوسرے غسل خانے میں چلا گیا۔ ابو قاسم غسل کر چکا تو باہر نکلا اور کپڑے پہننے لگا۔ اب جو اس کی نظر جوتوں پر پڑی تو ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے پھٹے پرانے جوتوں کے بجائے بالکل نئے جوتے رکھے ہوئے تھے۔

ابوقاسم کچھ دیر تو سر کھجاتا رہا پھر اس نے سوچا، شاید میرے دوستوں نے میرے لیے نئے جوتے خریدے ہوں۔ چلو مفت میں جوتے مل گئے۔ میرے پیسے بچ گئے۔ یہ سوچ کر اس نے جوتے پہن لیے اور خوشی خوشی گھر کی طرف چل دیا۔ اب مزے کی بات یہ کہ کسی مسخرے نے ابوقاسم کے جوتے اٹھا کر کوتوال کے کپڑوں کے پاس رکھ دیے اور کوتوال کے جوتے ابوقاسم کے کپڑوں کے پاس رکھ دیے۔

کوتوال باہر نکلا تو اپنے جوتوں کی جگہ ابوقاسم کے جوتے دیکھ کر غصے سے آگ بگولہ ہوگیا۔ اس کے سپاہیوں نے حمام کا چپا چپا چھان مارا مگر جوتے نہ ملے۔ ملتے کیسے وہ تو ابوقاسم پہن کر چل دیا تھا۔

ابوقاسم کے جوتے سارے شہر میں مشہور تھے۔ لوگوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ اس کے جوتے ہیں۔ کوتوال نے حکم دیا کہ ابوقاسم کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس نے نئے جوتے خریدنے کے بجائے ہمارے جوتے چرا لیے ہیں۔

سپاہیوں نے جاتے ہی ابوقاسم کی مشکیں کس لیں اور اسے گھسیٹتے ہوئے کوتوال کے پاس لے آئے۔ کوتوال نے اسے ایک ہزار روپے جرمانہ کیا اور اپنے جوتے واپس لے لیے اور اس کے واپس کر دیے۔ ان جوتوں کی وجہ سے سارے بغداد میں ابوقاسم کی بدنامی ہوئی اور اسے ایک ہزار روپے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس نے سوچا کہ یہ جوتے مصیبت ہیں، انہیں کہیں دور پھینک دینا چاہیے۔

اس نے گھر آ کر کھڑکی کھولی اور جوتوں کو باہر پھینک دیا۔ کھڑکی کے نیچے دریا بہتا تھا۔ جوتے دریا میں جا گرے۔ دوسرے دن مچھیرے نے دریا میں جال ڈالا، جال میں مچھلیوں کے بجائے ابوقاسم کے جوتے پھنس گئے جس سے مچھیرے کا جال جگہ جگہ سے کٹ گیا۔ وہ اس لیے کہ جوتوں میں جگہ جگہ کیلیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مچھیرا غصے میں آ گیا۔ اس نے جوتے اٹھائے اور ابوقاسم کی کھڑکی کے اندر پھینک دیے۔

کھڑکی کے پاس عطر کی شیشیاں پڑی تھیں۔ جوتے پٹاخ سے شیشیوں پہ گرے۔ شیشیاں فرش پر گر کر چور چور ہوگئیں اور سارا عطر بھی بہہ گیا۔ بے چارہ ابوقاسم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سیکڑوں کا نقصان ہوگیا تھا۔ اب تو اسے ان جوتوں کی شکل سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اسے ایسی جگہ پھینکنا چاہیے جہاں سے کسی کو بھی نہ ملیں۔ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ خوش ہو کر بولا: بس یہ ٹھیک رہے گا زمین میں دبادوں۔

ابوقاسم اپنے باغ میں گیا اور گڑھا کھودنے لگا۔ ایک پڑوسی ادھر نکل آیا۔ اس نے ابوقاسم کو گڑھا کھودتے ہوئے دیکھا تو دل میں کہنے لگا کہ ضرور اسے کوئی خزانہ ملا ہے تبھی یہ گڑھا کھود رہا ہے۔ میں ابھی جا کر وزیر کو بتاتا ہوں۔ بادشاہ کا حکم تھا جب کسی کو خزانہ ملے تو فوراً حکومت کو خبر کردے ورنہ سخت سزا ملے گی۔

وزیر نے ابوقاسم سے پوچھا: بتاؤ خزانہ کدھر ہے؟

ابوقاسم نے کہا: حضور خزانہ کیسا؟ میں تو اپنے جوتے زمین میں گاڑھ رہا تھا۔

وزیر بولا: کوئی جوتے بھی زمین میں گاڑھتا ہے؟ ضرور تمہیں کوئی خزانہ ملا ہے۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ ایسی سزا دوں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔

ابوقاسم بہتیرا چیخا چلایا، قسمیں کھائیں مگر وزیر نے ایک نہ مانی اور اس پر اسے دس ہزار روپے جرمانہ کردیا۔

ابوقاسم روتا پیٹتا گھر آیا۔ یہ جوتے اس کے لیے عذاب بن گئے تھے۔ ان کی وجہ سے اسے ہزاروں روپے کا نقصان ہوگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے ایسی جگہ پھینک دے جہاں سے کبھی بھی نہ مل سکیں۔

دوسرے دن ابوقاسم صبح سویرے نکلا اور دوسرے شہر چلا گیا یہاں ایک تالاب تھا۔ ابوقاسم نے جوتے تالاب میں ڈال دیے اور اس وقت تک انہیں دیکھتا رہا جب تک وہ مکمل ڈوب نہ گئے۔ تب اس نے سکون کا سانس لیا اور گھر کی راہ لی۔

لیکن وہ تالاب کوئی معمولی تالاب نہیں تھا۔ اس تالاب سے پائپ کے ذریعے بغداد کو پانی جایا کرتا تھا اور یہی پانی سارا شہر استعمال کرتا تھا۔ ابو قاسم کے جوتے بہتے بہتے پائپ تک پہنچ گئے اور اس میں ایسے پھنسے کہ پائپ کا منہ بند ہوگیا۔

اس دن بغداد والوں کو پانی کی ایک بوند نصیب نہ ہوئی۔ سارے شہر میں شور مچ گیا۔ لوگ جلوس نکالنے لگے۔ بادشاہ کے سپاہی دوڑے دوڑے تالاب پر گئے۔ دو آدمی کشتی میں بیٹھے اور تالاب کھنگالا تو ان کے ہاتھ ابوقاسم کے جوتے آئے۔ سپاہی دیکھتے ہی پہچان گئے کہ یہ ابوقاسم کے جوتے ہیں۔ اس دفعہ ابوقاسم کو ایک مہینہ جیل میں رہنا پڑا اور دس ہزار روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے سوچا جوتے جلا دیے جائیں لیکن جوتے گیلے تھے تو وہ انہیں سکھانے کے لیے چھت پہ لے جا رہا تھا، اس کے ساتھ اس کا کتا بھی تھا۔

نیچے بادشاہ سلامت کی سواری گزر رہی تو کتے نے جوتے کو ٹھوکر مار کر نیچے گرا دیا۔ جوتا بادشاہ سلامت کے سر پر جا لگا تو سپاہیوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس کو دو سال کی قید کی سزا ہوئی اور ساٹھ ہزار روپے جرمانہ۔ اب ابوقاسم نے بادشاہ سلامت کو ساری کہانی سنا ڈالی اور سزا کم کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کی سزا معاف کردی۔ اب ابوقاسم بالکل کنگال ہوچکا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلی فرصت میں ہی اسے نئے جوتے خریدنے ہیں کیونکہ اب وہ سمجھدار ہوگیا تھا۔

□❖□

تعلیم

حنا راحت

چھوٹو ایک معمولی ڈھابے پر خدمت گار تھا، جو گاہکوں کو چائے پہنچاتا تھا۔ ظہور احمد بھی وہیں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ ایک چھوٹے معصوم بچے کو اس طرح کام کرتے دیکھ کر اسے بہت ترس آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ اس چھوٹے بچے سے بات کر کے پوچھے کہ وہ کس مجبوری کی وجہ سے یہاں کام کرتا ہے۔ وہ ہوٹل کے باہر بیٹھ کر چھوٹو کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

چھوٹو باہر آیا تو ظہور احمد نے چھوٹو کو آواز دی اور اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے پوچھا: بیٹا! تمہارا کیا نام ہے؟ اور تم کہاں رہتے ہو؟

وہ بولا: میرا نام شہریار ہے۔ میں یہاں قریب ہی رہتا ہوں۔ اس نے اپنے علاقے کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹا! تم اسکول نہیں جاتے ہو کیا؟

یہ سن کر شہریار اُداس سا ہوگیا اور بولا: میں بھی چاہتا ہوں کہ اسکول میں پڑھوں پر میرے ابو نے مجھے یہاں کام پر لگا دیا ہے۔

اگر میں تمہارے ابو سے بات کروں تو۔

شہریار بولا: نہیں نہیں۔ آپ ان سے بات نہ کریں، وہ بہت غصے والے ہیں۔

شہریار میں تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔ ظہور احمد نے کہا۔

ظہور احمد ایک اسکول ٹیچر تھے اور اس بچے کو یوں کام کرتا دیکھ کر بہت فکرمند ہوئے۔ صبح وہ اسکول کے لیے تیار ہوئے اور پہلے شہریار کے گھر پہنچے۔

شہریار اور اس کے والد سے کہا: میں آپ سے شہریار کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے والد نے روکھے انداز میں پوچھا: میرے بیٹے کے بارے میں کیا بات کرنا چاہتے ہو؟

آپ اپنے بیٹے سے کام کیوں کرواتے ہیں؟ ظہور احمد نے کہا۔

وہ بولے: یہ میرے گھر کا معاملہ ہے، آپ اس میں دخل کیوں دے رہے ہیں؟ میرے گھر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، اس لیے میں نے اسے کام پر بھیجا ہے کہ وہ کچھ پیسے کمالے۔

ظہور احمد نے کہا: اپنے بچوں کو پالنا اور انہیں تعلیم دلانا آپ کا فرض ہے۔ آپ اس بچے کا بچپن اور تعلیم دونوں کا نقصان کر رہے ہیں اور اتنے چھوٹے بچے سے مزدوری کروانا قانوناً جرم ہے۔

اب اگر آپ اپنے بچے کے ساتھ یہی کرتے رہے تو میں آپ کی رپورٹ کر دوں گا۔ اس کے بعد آپ جانیں اور قانون۔ آپ کو اس کی سزا بھی ملے گی اور جرمانہ بھی ہوگا۔

یہ سن کر شہریار کے ابو ڈر گئے کہ کہیں بڑا مسئلہ نہ بن جائے۔ وہ بولے: نہیں نہیں... میں شہریار کو اب کام پر نہیں بھیجوں گا، بلکہ اسے اسکول میں داخل کروادوں گا۔

ظہور احمد نے کہا: آپ ابھی میرے ساتھ آئیں اور شہریار کو اسکول میں داخل کروائیں۔

شہریار کے والد بولے: جی ٹھیک ہے، جیسے آپ کہیں۔

اور وہ ان کے ساتھ چل پڑے۔ شہریار بہت خوش تھا کہ اب وہ بھی تعلیم حاصل کر کے اچھا شہری بن جائے گا۔

□❖□

بادشاہ کا انوکھا واقعہ

ایک وقت تھا جب ملک کے بادشاہ کے اندر عبادت، پرہیزگاری اور دینی سمجھ بوجھ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آج کے اس گئے گزرے دور میں آدمی ان واقعات کو سنے تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔

جب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو کہرام مچ گیا۔ جنازہ تیار ہوا، ایک بڑے میدان میں لایا گیا۔ بے پناہ لوگ نماز جنازہ پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا جو حدنگاہ تک نظر آتا تھا۔ جب نماز جنازہ پڑھنے کا وقت آیا، ایک آدمی آگے بڑھا اور کہنے لگا کہ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا وکیل ہوں۔

حضرت نے ایک وصیت کی تھی۔ میں اس مجمع تک وہ وصیت پہنچانا چاہتا ہوں۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ وکیل نے پکار کر کہا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ وصیت کی کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کے اندر چار خوبیاں ہوں۔

(1) زندگی میں اس کی تکبیر اولیٰ کبھی قضا نہ ہوئی ہو۔

(2) اس کی تہجد کی نماز کبھی نہ چھوٹی ہو۔

(3) اس نے غیر محرم پر کبھی بھی بری نظر نہ ڈالی ہو۔

(4) اتنا عبادت گزار ہو کہ اس نے عصر کی سنتیں بھی کبھی نہ چھوڑی ہوں۔

جس شخص میں یہ چار خوبیاں ہوں، وہ میرا جنازہ پڑھائے۔ جب یہ بات سنائی گئی تو مجمع پر ایسا سناٹا چھایا جیسے مجمع کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ کافی دیر گزر گئی، کوئی نہ آگے بڑھا۔ آخرکار ایک شخص روتے ہوئے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے کے قریب آئے۔ جنازہ سے چادر اٹھائی اور کہا۔ حضرت! آپ خود تو فوت ہوگئے مگر میرا راز فاش کردیا۔

اس کے بعد بھرے مجمع کے سامنے قسم اٹھائی کہ میرے اندر یہ چاروں خوبیاں موجود ہیں۔ یہ شخص وقت کا بادشاہ شمس الدین التمش تھے۔□❖□

’ننھی منی دنیا‘ صفحہ سے متعلق اپنی آرا، کہانیاں یا دیگر تخلیقات ہمیں مندرجہ ذیل ای-میل یا ایڈریس پر مکمل نام اور پتہ کے ساتھ روانہ کریں:
response.roznamasahara@gmail.com
SAHARA URDU MEDIA
Sahara India Complex, C-3, Sector-11, Noida-201301